(غلام گردش)

نوحہ گر وہوں میں!

نظم وضبط، شدید محنت کی عادت اور کڑا ڈسپلن، جن قوموں نے ترقی کی ہے، بے وجہ نہیں۔ قدرت کے اُصول کے عین مطابق زندگی کا سفر طے کرنے کے بعد کی ہے۔ جب عام لوگوں میں یقین کی سرفرازی آجائے تو ریاست خود بخود آگے بڑھنے لگتی ہے۔ ہمارا راستہ جدا ہے۔ چند معدودے لوگ، ہر بے اعتدالی کرنے کی بدولت بہت ترقی کر گئے۔ مگر ملک، عوام بلکہ ہجوم دائروں کے سفر میں اطمینان سے شاد ہے۔ قدرت کے تمام اُصول پامال کرنے کی سزا بہر حال ہمیں دہائیوں سے مل رہی ہے۔ شائد ملتی بھی رہیگی۔ صاحبان! یہ ملک نہیں۔ یہ چند خاندانوں کے راجواڑے ہیں۔ وہی برصغیر کی ادنیٰ ترین اشرافیہ کے ترتیب شدہ اُصول، وہی علم سے نفرت، وہی محنت کرنے والے کو کمی کا درجہ دینے والے لوگ۔ ہر چیز فراموش کر دیجئے۔ سوچیے۔ ہمارے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ ہم اتنے تباہ حال کیونکر ہوئے۔ وقتی وباء، یعنی کرونا نے صحت کے نظام کو برہنہ کر کے سب کے سامنے رکھ ڈالا۔ نہ مریض محفوظ اور نہ ڈاکٹر۔ وزراء اعلیٰ اور وزراء اعظم کے پچاس ساٹھ سال کے بیانات جمع کیجئے۔ وقت ضائع کرنے کیلئے ہی، مگر انہیں ترتیب سے پڑھ لیجئے۔ بالکل ایک جیسی مصنوعی باتیں اور یکساں مداری پن۔ نتیجہ جمال ناصر کے مطابق صفر جمع صفر، صفر ہے۔ یہ الفاظ مصر کے صدر نے ساٹھ برس ہمارے عظیم ملک کے متعلق کہے تھے۔ لگتا ہے کہ ہمارے ملک کے متعلق کوئی سچا خواب آیا تھا۔ یا شائد وہ مستقبل میں جھانک سکتا تھا۔

بربادی کی کتھا کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم۔ ویسے یہ کیسا زوال ہے جو اختتام پذیر ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ اب تو سوچتے ہوئے، لکھتے ہوئے دل دکھتا ہے۔ پوری دنیا ترقی کر رہی ہے۔ ہم سے علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش بھی بھرپور ترقی کی جست لگا چکا ہے۔ مگر نہیں۔ اگر کم نصیبی ہے، تو صرف ہمارے یہاں اور ہماری وجہ سے افغانستان میں۔ ہم نے اس ہمسایہ ملک کو بھی برباد کر ڈالا۔ کیا بات کروں۔ کیسے کروں۔ ملکی ڈسپلن اور سیاست کی کمزوری کا ذکر کیجئے۔ مکہ اور مدینہ کرونا کی وجہ سے مکمل طور پر بند ہیں۔ مگر ہمارے چند علماء ہیں جو دبنگ طریقے سے اعلان کرتے ہیں کہ نہیں مساجد تو ہر قیمت پر کھلی رہینگیں۔ نمازی اگر مسجد سے کرونا کی صورت میں موت خرید کر لے جاتے ہیں تو ان علماء کی نظر میں یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ دنیا کے اکثر مسلمان ممالک نے تراویح کو مسجد میں پڑھنے سے منع کر دیا۔ مگر ہم پتہ نہیں کس نظریہ کے پیروکار ہیں۔ کہ کرونا وباء کی بھرپور موجودگی میں تراویح ضرور پڑھینگے۔ ہاں، مہربانی یہ ہے کہ شائد تعداد کم کر دی گئی ہے۔ ریاست، مذہبی علماء کے خوف سے دبک کر بیٹھی ہے۔ عام واقعات سامنے آرہے ہیں کہ اگر پولیس نے نمازیوں کو سمجھانے کی کوشش کی تو اُلٹا ان پر تشدد ہونے لگا۔ ریاست کی رٹ کا لفظ صرف اور صرف کاغذ تک محدود رہ گیا ہے۔ اب لاہور کی یہ حالت ہے کہ لاک ڈاؤن برائے نام رہ گیا ہے۔ ہر آدمی آرام سے باہر گھوم رہا ہے۔ سڑک کے کناروں پر محفلیں آباد ہیں۔ ماسک یا حفاظتی دستانے پہننا شائد اب بزدلی کی نشانی بن چکا ہے۔ یہاں ہر بندہ ببر شیر ہے۔ اپنے جنگل کا خودساختہ بادشاہ۔ کرونا کے خلاف کسی بھی حفاظتی تدبیر سے مبرا۔ اب آپ کیا کر لینگے۔ یہ وباء تو بھرپور طریقے سے پھیلے گی۔ بطور ڈاکٹر، مجھے خدشہ ہے کہ آنے والے تیس پینتیس دن میں لاپرواہی، ہمیں تباہی کے عمیق تندور میں جھونک سکتی ہے۔ دوسری طرف، ڈاکٹر بھی ناشاد ہیں۔ انکی تنظیمیں احتجاج کر رہی ہیں کہ

انکے پاس کرونا سے متعلق حفاظتی لباس اور دیگر اشیاء نہیں۔ ہر صوبائی حکومت فرما رہی ہے کہ ڈاکٹروں اور پیرامیڈیکل سٹاف کے پاس سب کچھ ہے۔ان میں سے سچ کون بول رہا ہے۔اسکا فیصلہ کرنا اَز حد آسان ہے۔کسی سرکاری ہسپتال میں چلے جائیں۔انتظامات دیکھ کر دل بجھ جائیگا۔مگر وزراء کی فوج حقیقت پسندی سے کام لینے کی بجائے محض سیاست کر رہی ہے۔سندھ حکومت اور مرکزی حکومت، مکمل طور پر ایک دوسرے کے لفظی حد تک بھرپور مخالف ہیں۔لگتا ہے دو دشمن ریاستوں میں جنگ ہو رہی ہے۔

گزشتہ چند دن پہلے، وزیراعظم نے ایک میڈیکل پنڈال کا دورہ کیا۔فرمایا کہ کرونا سے بچنے کیلئے ہر چیز اب ہمارے عظیم ملک میں تیار ہو رہی ہے۔احسن بات ہے۔وزیر سائنس نسبتاً جوان ہیں۔کام کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔اچھا لگا۔مگر جب یہ بتایا گیا کہ ملک میں وینٹی لیٹر بھی بننے شروع ہو چکے ہیں۔تو سوال ذہن میں اُٹھا کہ چلو، اگر اسے درست مان لیا جائے۔تو کیا، وزارت سائنس کا کوئی بابو، قوم کو ان وینٹی لیٹر کی Specifications بتائیگا۔تا کہ ہم جیسے جاہلوں کو اندازہ ہو، کہ جرمنی، جاپان، امریکہ، روس، ساؤتھ کوریا کیا جھک مار رہے ہیں۔صرف دو تین ماہ میں ایسا ٹیکنیکل کارنامہ انجام دے دیا ہے کہ اب پوری دنیا کی حکومتیں، ہاتھ باندھ کر ہماری طرف دیکھ رہی ہیں۔کہ جناب ہماری طرف بھی نظرِ کرم فرمائیں۔ہمیں بھی یہ گُر بتائیے۔کہ ہم اربوں ڈالر کی فیکٹریاں لگا کر بھی آپ جیسے بلند معیار کے وینٹی لیٹر نہیں بنا پائے۔ساتھ ہی یہ بھی اعلان ہوا کہ ٹیسٹنگ کٹیں بنانا بھی ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔انکا معیار کیا ہے۔وہ کتنے فیصد درست تشخیص کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔کچھ بھی بتایا نہیں گیا۔کوئی ایسا معیاری ڈیٹا مہیا نہیں کیا گیا کہ ہمارے جیسے طالبعلم اندازہ لگا سکیں کہ ہمارے ملک نے اتنی بڑی انہونی، اتنے کم وقت میں کیسے برپا کر دی۔ہمارے پاس تو بین الاقوامی معیار کا کوئی ایسا ادارہ نہیں، جو یہ ٹیکنیکل کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔خیر وقت بتا دیگا کہ ہم نے کیا کہا تھا اور ہمارے اعلان اور ذہنی حقائق میں کس قدر فرق ہے۔مگر اس وقت تک کرونا کا کھیل ختم ہو چکا ہوگا۔اور کوئی نیا بحران ہمارے سامنے قیامت بنکر کھڑا ہوگا۔اسلیے کون یاد رکھے گا کہ ماضی میں کیا اعلانات فرمائے گئے تھے۔

مگر صاحبان! ہم طلسم گھر کے مکین ہیں۔یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔چلیے، حکومت تو اس وباء سے لڑنے کیلئے چندہ مانگ رہی ہے۔مگر ہماری اکثریت این جی اوز، مشہور خیراتی تنظیمیں، ہم سے بار بار ٹی وی پر آ کر صدقے اور خیرات کے پیسے کیوں مانگ رہی ہیں۔آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ ہمارے خیرات کیے پیسوں کا استعمال کس طرح ہو رہا ہے۔یہ حضرات، بہترین سوٹ پہن کر، قیمتی گاڑیوں میں سفر کرنے کے باوجود، مصر ہیں کہ انکو چندہ دیا جائے۔اگر حکومت غلطی سے انکا آڈٹ کروانے کی جسارت کر لے تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔اربوں روپوں کی گرانٹس کا کوئی معیاری حساب کتاب نہیں ہے۔پر نہیں، جناب، ہمارے جیسے گنہگار، یہ بات نہیں کر سکتے۔اسلیے کہ ان جعلی لوگوں نے اوپر سے نیچے تک سماجی، سیاسی اور مذہبی نظام کو قابو کر رکھا ہے۔صرف ایک عبدالستار ایدھی آیا تھا۔اب اس جیسا کوئی صائب کردار بندہ نہ آئیگا، اور نہ ہی آنے دیا جائیگا۔این جی اوز کا نظام اس قدر فعال ہے کہ انکے خلاف ذرا بات تو کر کے دیکھیں۔آپکے پرخچے اُڑا دیے جائینگے۔ایک ایسی ہی چندہ مہم میں خاکسار نے بھی مقدور بھر پیسے دیے۔آج تک معلوم نہ ہو پایا کہ ان پیسوں سے کس غریب کی اشک شوئی کی گئی۔پوچھنے کی جسارت کی تو بڑے صاحب نے ڈانٹنے کے انداز میں فرمایا کہ ہمارے

اوپر شک کرتے ہو۔دفتر کے پورچ میں ڈیڑھ کروڑ کی جیپ موجود تھی جو ثابت کر رہی تھی کہ وہ غریبوں کی بخوبی خدمت کرتے ہیں؟ صاحبان! ہم عیار ترین نہیں بلکہ سفاک ترین گروہوں کے پنجوں میں پھنس چکے ہیں۔ریاستی اداروں کی دسترس سے جو چند خون کے قطرے بچ جاتے ہیں وہ، یہ سماجی بحری قذاق، نچوڑ لیتے ہیں۔عام لوگ کس کس جال سے بچیں۔ بلکہ اب تو یہ لگتا ہے کہ اس عوام کے ساتھ جو ہو رہا ہے، وہ درست ہو رہا ہے۔انکے ساتھ یہی کاریگری ہونی چاہیے۔

جب سارے ادارے ایک دوسرے پر یقین نہ کر رہے ہوں۔جب انکے اندر وسائل کو حاصل کرنے کی بے رحمانہ کشمکش جاری ہو،تو عام لوگ بھی ہر طرح سے اعتماد کھو بیٹھتے ہیں۔انہیں اندر سے پتہ ہوتا ہے کہ انکے ساتھ ہر طرح کا جھوٹ بولا جا رہا ہے۔نتیجہ یہ کہ وہ بھی،اس عظیم الشان دروغ گوئی کے شہر میں اینٹ بنکر رہ جاتے ہیں۔اگر حکمران یا مضبوط طبقہ بڑے بڑے فراڈ کرتا ہے تو متوسط طبقہ یا چھوٹا طبقہ،اپنی سطح کے فراڈ کرنے شروع کر دیتا ہے۔آپ یہاں کسی کو چند ہزار روپے اُدھار دیکر واپس لیکر دکھایئے۔آپکو ایسا لگے گا کہ آپ نے پیسے اُدھار نہیں دیے۔ بلکہ آپ نے بذاتِ خود پیسے اُدھار لے رکھے ہیں۔لین دین میں مکمل طور پر گھٹیا پن ہمارا قومی مزاج ہے۔

فیصل آباد سے میرا ایک بے حد پرانا بلکہ قدیم دوست،حد درجہ وجیہہ انسان ہے۔پیشے سے تاجر ہے۔ایک ٹیکسٹائل مل کا مالک ہے۔چند برس پہلے ملنے آیا تو لمبی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ماتھے پر محراب تھی۔میں ہرگز ہرگز داڑھی اور محراب کے متعلق منفی سوچ نہیں رکھتا۔مگر جب اس سے کھل کر بات چیت ہوئی تو ہنستے ہوئے کہنے لگا کہ ڈاکٹر، یہ مذہبی حلیہ، ہماری تجارت کیلئے حد درجہ مفید ہے۔لوگ اس حلیے کی بدولت بہت جلدی اعتبار کر لیتے ہیں۔پھر منافع ہی منافع ہے۔اس نے تاجروں اور سیٹھوں کے متعلق جو باتیں کیں، میں لکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔اسلیے کہ ہوسکتا ہے کہ دین کے دائرے ہی سے خارج کر دیا جائے؟ اپنے دوست کی باتیں سننے کے بعد دل مزید بیٹھ گیا۔کس پر اعتبار کریں اور کس پر نہ کریں۔جب ہر ادارہ اور ہر شخص ہی زوال کا شکار ہے تو پھر کوئی فکر کی بات نہیں۔سب کچھ سامنے نظر آنے کے باوجود،ہمیں باور کروایا جا رہا ہے کہ نہیں نہیں سب کچھ ٹھیک ہے۔کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں۔زندگی معمول کے مطابق جاری وساری ہے۔مگر سوال تو یہ ہے کہ کون سی زندگی،کون سا معمول۔یہاں تو میلوں تک صرف جھوٹ اور فریب کی دھول اُڑ رہی ہے۔رذیل شادمان ہیں اور شرفاء پامال۔دل چاہتا ہے کہ میں بھی بہت اچھی اچھی باتیں لکھوں۔مگر کیا کروں جو دیکھ رہا ہوں۔اس سے مفر کیسے حاصل کروں۔یہ نوحہ تو بہر حال لکھنا ہی ہے!

راؤ منظر حیات